غزالہ نگار اورکزئی
www.paksociety.com

غزالہ نگار اوکزئی

شیشوں پہ گرتے ٹپ ٹپ بارش کے قطرے
(میرے دل کے اندر ہوتی بارش کی طرح)
نارنجی کے شگوفوں سے اٹھتی مدھم سی مہک۔۔۔
کافی کی ٹھنڈی پیالی کی مٹی تلخ خوشبو۔۔۔

ایک بار پھر' ایک ساعت کو اپنے سارے دیگر احساسات مٹ سے گئے ہیں۔ جب تمہاری روشن' چمکتی مسکراتی آنکھیں یاد آتی ہیں۔ اس طرح کہ میرے وجود پہ کپکپی سی طاری ہونے لگی ہے اور تمہاری خوشبو اپنے آس پاس محسوس ہونے لگی ہے۔ شاید کسی اسٹوڈیو کا بند دروازہ کھلا ہے۔ پل بھر سازوں کی اور کسی مغنیہ کی پُرسوز آواز کانوں سے ٹکرائی ہے۔

دل کی بستی میں تمناؤں کے سائے بھی نہیں

اور اگر اس وقت صاحبزادہ ایاز نے میرے آفس میں جھانکا تو مجھے یوں سگریٹ نوشی کرتے دیکھ کر بہت ناراض ہوگا۔

"میرا! بہت گندی بچی ہو تم' بھونڈی حرکت اور کس قدر غیراہم شخص کے لیے پھونک رہی ہو تم خود کو۔"

غیراہم شخص۔۔۔ زین حیدر۔۔۔ میں تو اتنے سالوں میں بھی فیصلہ نہ کرسکی کہ تم میرے لیے کس قدر اہم رہے اور دوسروں کے لیے کتنے غیراہم ثابت ہوئے' لیکن دوسرے کب میری طرح دل کے پل صراط سے گزرے ہیں بھلا؟ کب میرے جیسا عذاب کاٹا ہے انہوں نے۔ برسوں آس کے نازک تار سے لٹکے کاٹے ہیں میں نے۔ اذیت سہی ہے کتنے موسموں کی۔

پر اس سارے قصے میں صاحبزادہ ایاز کا کیا قصور۔۔۔؟ وہ تو اللہ تعالیٰ نے کرم کیا مجھ پہ۔۔۔ جو ایاز جیسا بے بدل دوست دیا ہے۔ اتنا خوبصورت۔۔۔ اتنا ہمدرد۔۔۔ ایسا لاثانی انسان جس میں بہت سی باتیں فرشتوں والی ہیں۔

اسی نے تو اپنی پُرخلوص رفاقت سے مجھے سر اٹھا کر چلنے کا حوصلہ دیا ہے۔ تب جب میں جذباتی طور پر بالکل فنا ہوچکی تھی۔ ہاں یہ ہے زین حیدر! کہ اب تم اس کے لیے بے حد ناپسندیدہ آدمی بن چکے ہو اور وہ تمہیں صرف میرے لیے برداشت کرتا رہا ہے۔

"تم نے زندگی میں بلنڈرز تو بے شمار کیے ہوں گے۔ میرا حسن! لیکن یہ غلطی ناقابل معافی ہے۔" وہ اکثر کہتا ہے۔

شاید ایک گھنٹہ قبل اس نے تمہیں میرے آفس سے نکلتے نہیں دیکھا' ورنہ فوراً" آتا اور مجھے اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتا۔ تمہارے جانے کے بعد ہمیشہ اس نے مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑا۔ پڑھ لیتا ہے میرے چہرے کو' میری روح کے ایک ایک زخم کو۔ جان لیتا ہے ہر دکھ کی خاموش آوازیں۔ شاید اتنا تو میں بھی خود کو نہیں جانتی' ہاں یہ وہی کاردارد۔۔۔ ہے جو تم نہ کرسکے کبھی۔

وہ میری توجہ ہٹانے کے لیے جب اپنے ڈراموں کے لیے میرے مشورے مانگتا ہے تو مجھے تبھی اچھی طرح علم ہوتا ہے کہ اسے میرے مشوروں کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تین سال اس کی اسسٹنٹ رہی ہوں اور مجھے پتا ہے پی ٹی وی کا یہ سینئر پروڈیوسر کتنا ذہین ہے۔

پر یہی تو وہ ڈھکے چھپے طریقے ہیں جن سے اس نے بڑے بڑے آرٹسٹ پیدا کیے ہیں اور میرے بار بار مرتے وجود میں ہر بار ایک نئی روح پھونکی ہے۔

اب تو وہ یہی سوچ رہا ہوگا کہ میں اپنی نئی ڈاکیومنٹری کے اسکرپٹ پہ کام کررہی ہوں جو آثار قدیمہ پر ہے اور میں سوچ رہی ہوں' میرا دل بھی کیا کسی موہن جودڑو' کسی ٹیکسلا سے کم ہے۔ ایسا کھنڈر ایسا پُرہول' ایسا شکستہ کہ کوئی میری آنکھوں میں جھانک پائے تو اس کی روح بھی لرز اٹھے۔

اور میں ابھی وہ سگریٹ بھی ایش ٹرے سے نکال کر سنبھالوں گی جو تم نے کچھ دیر پہلے اس آفس میں بیٹھ کر پیے تھے۔

بڑا خزانہ ہے میرے پاس زین حیدر!

وہ ماچس کی تیلیاں جن سے تم اپنے سگریٹ جلاتے تھے' سگریٹ کے بیکار ٹکڑے' جو تم ایش ٹرے میں مسلتے تھے' وہ چند ایک کاغذ جن پر تم اپنے پروگرامز کے نوٹس لیتے تھے' وہ ویڈیو ٹیپس' تمہارے کامیاب

اور مقبول پروگراموں کے۔

اور یہ شکستہ محل سرائے دل کی جس پہ سوائے ایاز کے کسی کی نظر نہیں پڑی۔

سنو زین حیدر! کبھی اپنے بے شمار مریضوں کی آنکھیں دیکھتے، میری آنکھیں کبھی دیکھی ہوتیں، شاید تب تم سمجھو گے جب یہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گی۔

کبھی اپنے مریضوں کے دل کی دھڑکن سنتے سنتے میری دھڑکنیں بھی محسوس کرتا، وہ وقت آنے سے پہلے جب یہ تھک کر ہمیشہ کے لیے رک جائیں گی۔

لیکن تم تو ساری دنیا سے ایسے بے زار رہے زین حیدر! کہ تم نے مجھ سے بھی انصاف نہ کیا۔

سوچتی ہوں واقعی صوفیہ بدقسمت عورت تھی جس نے تمہاری رفاقت چھوڑنے میں بہتری جانی یا تم زیادہ بدقسمت ہو جس نے اس سمت دیکھا ہی نہیں کہ جدھر سے محبتوں کے دائمی خوشیوں کے سورج طلوع ہو سکتے تھے۔ تمہارے لیے بھی، میرے لیے بھی، ایک روشن افق بھی ہوتا ہے۔ زین حیدر! ہم سب کی زندگی میں لیکن المیہ یہ ہے کہ ہم سب پیٹھ موڑے، بے خبر اندھیروں کی سمت محو سفر رہتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ ہماری پیٹھ پیچھے چمکنے والے سورج، چاند ستارے سب غروب ہو جاتے ہیں اور روشن افق تاریکیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔

صوفیہ دنیا کی آخری عورت نہیں تھی، زین! تم نے اس سے ناتا ٹوٹنے کے بعد ہر عورت کو ایک ہی عینک سے ایک ہی زاویہ نظر سے دیکھا اور بے حد غلط رنگ میں دیکھا۔ کیا یہ تم جیسے پڑھے لکھے آدمی کی جہالت نہ تھی؟

جب آپس میں نہ بنے تو خوشی سے ایک دوسرے کو آزادی دینا کیا بہتر عمل نہیں۔ بجائے اس کے کہ خود کو باندھ کر بھی رکھا جائے اور ناخوش بھی رہا جائے۔

تمہارے پیروں میں بچوں کی زنجیر بھی نہ تھی اور بقول تمہارے صوفیہ تمہیں پسند بھی نہ آ سکی، پھر کیا وہ روایتی مرد کی انا نہ تھی جس نے تین سال تک تمہیں اور صوفیہ کو ایک بے مقصد مقدمے میں الجھائے رکھا۔ جس کے انجام کا تمہیں بخوبی علم تھا کہ صوفیہ کے حق میں ہی ہونا ہے۔

اور جب میں اپنے بارے میں سوچتی ہوں تو اپنی بے بسی اور بے چارگی پہ بہت ترس آتا ہے۔

یہ میرا حسن جیسی باتونی لڑکی کی بے بسی نہیں تو اور کیا ہے؟ کہ دل کے مقدمے کی پیروی کرنے اور اپنا مقدر اندھیروں میں ڈوبنے سے بچانے کے لیے اس کے ہونٹوں سے ایک حرف تک نہ نکلا اور یوں تو اپنے ڈیبیٹس (تقاریر) سے بڑے بڑے ایوان ہلا کے رکھ دیا کرتی تھی۔ پر یہ دل کا میدان شاید ہر سورما کا واٹرلو ثابت ہوتا ہے۔

محبت کیسی انوکھی شے ہے۔ یہ خانہ بدوش چپکے سے آ کر دل میں ڈیرہ ڈال دیتی ہے اور اپنے خوابوں کی طنابیں ایسی، مضبوطی سے باندھتی ہے کہ کوئی آندھی، کوئی طوفان اس خیمے کو اکھاڑ نہیں سکتا۔ زمین دل اجڑ جاتی ہے۔ بنجر ہو جاتی ہے۔ پر یہ آکاس بیل اس زمین سے نہیں ہٹتی۔

اس کا مضبوط پنجہ نہیں ہٹتا اعصاب سے۔

تم نہیں ہوتے لیکن میری آنکھیں تمہیں دیکھتی ہیں۔ تم نہیں ہوتے، پر میں تمہارے نفس نفس کی خوشبو محسوس کرتی ہوں۔

اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ تمہاری آواز میری سماعت میں وہ خواب بن کر بولنے لگتی ہے۔ جن کی تعبیر میری پتھر آنکھیں کبھی نہ دیکھ پائیں گی۔

میری محبت دیوانگی کی حدوں کو چھونے لگی ہے زین حیدر! اور مجھے اس دیوانگی سے خوف آتا ہے۔ آخری تباہی بے حد خوفناک ہوگی اور کون سی قیامت آئے گی بھلا؟ آخری قیامت تو اسی روز آتی ہے اور اس کے بعد ہر خواب، ہر امید کا بدن، ہر آس کا چہرہ فنا ہو جاتا ہے۔ جب اجڑ جاتی ہے ساری کائنات اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ پر ایاز کہتا ہے اس مرحلے سے آگے قرار ہی قرار ہے۔ سکون ہی سکون ہے اور سکون کیا ہوگا؟ موت کا دوسرا نام۔

پر میں، میں تو سو سو بار مری ہوں، ہاں اس شخص، ایاز

نے مجھے دفن نہیں ہونے دیا۔

اتنا جھنجوڑا ہے کہ میری جڑیں تک ہل گئی ہیں۔ ڈانٹا ہے، سمجھایا ہے بلکہ زندگی کی طرف ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا ہے۔

بڑا منہ زور ہے۔ یہ ایاز، ارم کی موت کے بعد شاید قسم کھائی تھی اس نے کہ اور کسی طاقت سے شکست نہیں کھائے گا۔

یہ جو اتنے ملکی اور غیر ملکی اعزازات سجے ہیں میرے آفس میں، ان میں صرف میرے ٹیلنٹ کا ہاتھ نہیں۔ میرے کندھے پہ تو ہمیشہ ایاز کا مشفق ہاتھ اور میرے ساتھ اس کے روشن کردہ چراغ رہے جنہوں نے میری راہ متعین کی۔

جس دن تم، ہارون فیض کے ساتھ اپنے پہلے پروگرام کی کمپیئرنگ کے لیے اسٹوڈیو نمبر چار میں داخل ہوئے تھے، تب ہی میری روح کو اپنا کھویا ہوا نصف بہتر اپنے آس پاس محسوس ہوا تھا اور وہ سرابٹ کے اس احساس پہ جی چاہا تھا کسی قدیم دھن پہ کوئی کلاسیکل گیت گاؤں اور ہواؤں کو پکار کر بتاؤں کہ یہ ملن کی شام ہے اور پھر کوئی بے حد مدھر، جادوگر ناچ ناچوں اور کائنات میری ہمراہی میں ناچے کہ محبت کا نغمہ بھی کائنات کا پہلا نغمہ ہے اور یہ نغمگی زندگی کے ہر سُر میں رچی بسی ہے اور چاہت کا رقص بھی اس آفاقیت کا حصہ ہے۔ اس دنیا کا سب سے قدیم اور مقدس رقص ہے۔ جس کی تال ابدی اور لافانی ہوا کے بدن میں اس کے انگ انگ میں پوشیدہ ہے۔

لیکن ہوا یہ کہ تم کیمرے کی آنکھ کو دیکھتے، اسکرین پر اپنے مہمانوں کو متعارف کراتے اور میں وی ٹی آر روم میں بند ہر شام یہ سوچتے گزار دیتی کہ کس فریکوئنسی پہ میری روح کی آواز تم تک پہنچے گی؟

فیض کی پوسٹنگ کے بعد یہ پروگرام میں تنہا ہی پروڈیوس کرتی رہی۔ پر بڑا لیا دیا سا رویہ رہا ہمارا۔ بڑا رکھ رکھاؤ والا تعلق، نہ تم جان سکے، نہ میں کہہ سکی۔

یہاں تک کہ تباہیٔ دل کی پہلی شام آ گئی۔

میں اور صاحبزادہ ایاز ایک نئے پروگرام کے پائلٹ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

تم میرے آفس میں آئے اور ایک کارڈ میرے سامنے رکھ دیا۔

میں نے استفہامیہ نگاہوں سے تمہیں دیکھا۔

"میری شادی ہے اگلے ہفتے اور میرا! تم ضرور آؤ گی۔" تم نے بڑی سادگی اور بڑے اصرار سے پہلا خنجر میرے دل میں اتار دیا۔

میں تمہاری صورت دیکھتی رہ گئی۔

"کیسی بداخلاقی ہے میرا جی! تمہیں مبارک باد تو دینی ہی چاہیے تھی ڈاکٹر حیدر کو۔"

ایاز نے نرمی سے کہا۔

تب مجھے احساس ہوا، تم جا چکے تھے، کتنی ساعتیں گزر چکی تھیں اور ان اذیت ناک، بے نام لمحوں نے میری روح کے سارے بند، در ایاز کے لیے کھول دیے تھے۔ میرا دکھ عریاں ہو گیا تھا اور وہ بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تھا، ناکام ہو گئی تھی۔

ایاز نے بڑے پیار سے میرا ہاتھ تھاما اور آہستہ سے بولا۔

"ایسے موقعوں پر چپ ہی رہتے ہیں لڑکی! کچھ نہیں کہتے، خاموشی سے سہتے ہیں۔ دنیا کا ظرف اتنا بلند نہیں ہے۔"

اس شام ایاز نے مجھے گھر پہنچایا تھا۔ میری گاڑی چلاتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔

"میرا! جو ڈرامے ہم اسکرین پہ دیکھتے ہیں نا، کبھی کبھار زندگی میں ہمارے ساتھ بھی پیش آ جاتے ہیں۔ بہادر بنو میرا! تمہیں اس ساری صورت حال کو برداشت کرنا ہے اور کوئی راستہ نہیں ہے، کوئی پناہ گاہ نہیں ہے۔"

اس نے ایک ماہ کی چھٹی لے کر مجھے آرام کرنے پر مجبور کیا تھا اور جب چھٹی گزار کر بڑی حد تک خود کو سنبھال کر میں ٹی وی واپس آئی تھی تو میرا کمرہ سویٹ پیز سے مہک رہا تھا اور میری میز پر ایک کارڈ سجا تھا۔

"ویلکم ہوم ایاز۔"

میری آنکھوں سے تشکر کے آنسو بہہ نکلے تھے،

اسی شخص نے تو اس پورے مہینے میں بیٹھ کر میرے دکھ سکھ سنے تھے۔ میرے آنسو پونچھے تھے۔ مجھے تسلیاں دی تھیں اور مجھے کتھارسس کی کیفیت دی تھی۔ اب میں ہلکی تھی کیونکہ میرے سارے بھاری دکھ اس نے اپنے کاندھوں پہ اٹھالیے تھے۔

میری چھٹیوں میں رشیدہ لطیف میرا پروگرام پروڈیوس کرتی رہی تھی اور میں نے خود اس سے درخواست کی تھی کہ وہ یہ پروگرام جاری رکھے کیونکہ تمہارا ایک مرتبہ پھر سامنا کرنا میرے لیے پل صراط سے کٹھن مرحلہ تھا۔ پر ایاز نے مجھے اپنا پروگرام واپس لینے پر مجبور کردیا۔

"یہ دنیا ہے میرا حسن! کہاں جاؤگی تم بھاگ کر' کسی نہ کسی موڑ پہ زین حیدر کا سامنا تو تمہیں کرنا ہی ہوگا' اس سے کوئی فرار نہیں۔"

وہ پریس کلب کے لان میں بیٹھ کر مجھے سمجھاتا رہا اور میں اپنے آنسو پیتی رہی۔

"یہ زندگی زہر کا پیالہ بھی ہے میرا! سقراط نے تو ایک ہی بار اپنی رگیں سیراب کرلی تھیں نا' ہمیں تو قطرہ قطرہ' گھونٹ گھونٹ اپنے ہونٹ تر کرنے پڑتے ہیں۔ اپنے پورے محسوسات کے ساتھ موت کو اپنی رگوں میں اتارنا پڑتا ہے۔ ہم محبتوں کے زخم خوردہ لوگ حقیقتاً "اتنے خوش قسمت بھی نہیں میرا! لیکن یہ بھی ہے کہ ہمیں مہاویوں اور رشیوں سے زیادہ کٹھنائیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔"

مجھے سمجھاتے سمجھاتے وہ خود جانے کہاں کھو گیا تھا۔ پہلی بار میں نے اس کے چہرے پر تھکن جاگتی لہراتی دیکھی تھی۔

اور بالآخر مجھے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے تھے کیونکہ میرا محافظ صف آرا تھا اور وہ پسپا ہونے والوں' ہتھیار ڈالنے والوں میں سے نہ تھا۔

پھر تم سے ملاقات ہوئی تھی' تم نے میرا حال پوچھا تھا' صحت یابی کی مبارک باد دی تھی۔ پر یہ نہیں پوچھا کہ مجھے بیماری کیا تھی؟ حالانکہ تم ڈاکٹر تھے اور میں دو سال سے تمہاری پروڈیوسر۔ شاید تم مجھ سے خفا بھی تھے کہ میں تمہاری شادی میں شریک نہ ہوئی تھی' پر اس وقت اس بات کی تمہارے نزدیک کیا اہمیت کہ تم خود ان ابتدائی ایام میں بے حد خوش تھے اور تمہیں اس بات کا گمان بھی نہ تھا کہ میں اندر سے کرچی کرچی ہوئی جاتی تھی۔

☼ ☼ ☼

زندگی کی پھر وہی پرانی ڈگر وہی معمولات۔

یہاں تک کہ میں نے تمہاری آنکھوں میں جھانکتی پریشانیاں دیکھیں۔ تمہیں چین اسموکنگ کرتے دیکھا۔ تمہیں ذہنی طور پر غیر حاضر دیکھا' پر یہ پوچھنے کی ہمت نہ پیدا کرسکی کہ کیا ہونے لگا تھا؟ کیوں ہونے لگا تھا؟ مجھے تمہارے ذاتی معاملات کو کریدنے کا کون سا حق ملا تھا بھلا؟

پر ایک دن تم خود ہی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے تھے۔

وہ ریکارڈنگ سے پہلے اسکرپٹ کو ری ٹچ دینے کی شام تھی اور رات کے دس بج گئے تھے۔ کام کرتے کرتے تمہیں کافی پتا کردیتے ہوئے میں نے سرسری انداز میں بات کی تھی۔

"سگریٹ بہت پینے لگے ہو زین!"

تم نے سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

"جن حالات سے میں گزر رہا ہوں میرا حسن کوئی اور ہوتا تو تمباکو سے نہیں ہیروئن سے خود کو پھونک ڈالتا۔"

میرا وجود برف ہونے لگا' کون سے حالات تھے تمہارے؟ کیا میری عذاب ناک راتوں اور میرے سنگلاخ دنوں سے زیادہ شدید تھے؟

پھر دفعتاً "تم میز پر آگے کی طرف جھکے۔

"ایک بات بتاؤ میرا! یہ ورکنگ ویمن کس گھمنڈ میں ہوتی ہیں آخر؟ کیا دنیا انہی کی کمائی پہ چلتی ہے فقط؟ اور میں تم سے اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ تم خود بھی ایک ورکنگ وومن ہو۔"

میں ساکت وصامت تمہیں دیکھتی رہ گئی۔ پر اتنا خیال مجھے ضرور آیا تھا کہ تم صوفیہ کی فل ٹائم ڈاکٹری سے خود کو ہم آہنگ نہیں کرپائے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ تم سے زیادہ محنتی ڈاکٹر تھی۔

تم نے ایک ثانیے کو گردن موڑ کر مجھے دیکھا اور میرا چہرہ دیکھ کر بولے۔

"معاف کرنا' میں بہت تلخ ہو رہا ہوں آج کل' میری زندگی غیر متوازن ہو رہی ہے۔" تم اٹھ کھڑے ہوئے۔ "شادیاں توڑنے کے لیے نہیں ہوتیں میرا! اور میں بھی ایسا ہونے نہیں دوں گا۔"

تم آفس سے باہر نکل گئے' میرا دل چیخ اٹھا تھا۔

"بے شک شادیاں توڑنے کے لیے نہیں ہوتیں زین حیدر! لیکن دل بھی تو توڑنے کے لیے نہیں ہوتے۔ یہ مقدس بارگاہیں۔"

کسی نے دروازے میں سے جھانکا تھا۔ "نئی ون ہوم؟" یہ ایاز تھا۔ دنیا کا واحد بندہ جو ٹی وی کو اپنا گھر سمجھتا تھا اور اپنا گھر تو اس کے لیے سرائے تھی بس۔

"تم آدمی ہو یا جن' کیسے کیسے وقت پر ٹپک پڑتے ہو؟" میں نے قدرے تلخی سے کہا اور اپنی ریوالونگ چیئر کھڑکی کی طرف موڑلی۔

جانے کیوں اس وقت مجھے اس کی آمد اچھی نہیں لگی تھی۔ شاید میں تمہارا دکھ صرف اپنے آپ کے ساتھ شیئر کرنا چاہتی تھی۔ کسی اور کو ایک جھلک نہیں دکھانا چاہتی تھی۔

پر ایاز نے میرے لہجے میں غصہ' محرومی' مایوسی اور آنسوؤں کی نمی سب ہی کچھ محسوس کرلی تھی۔

"زین حیدر باہر کوریڈور میں ٹہل رہا ہے اور کافی پریشان دکھائی دیتا ہے۔"

اس نے بہت آہستہ سے کہا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا' میرے پاس تھا کیا کہنے کو۔ میں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

"تم کیسے لوگو! کیا ایسا کرنے سے تم اپنی حالت' اپنی کیفیت چھپالوگے؟" ایاز نے بڑے پیار اور نرمی سے کہا۔

"جانے یہ شخص کب تک پریشان کرے گا مجھے یا اس عذاب کا کوئی اختتام ہی نہیں؟" ایسے کہتے ہوئے مجھے اپنی ہی آواز اجنبی لگی۔

ایاز نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "میرا جی! تم نے خود ہی اپنی محبت کو جی کا عذاب بنا رکھا ہے' تم نے اس شخص کو اپنے حواسوں پر بری طرح مسلط کرلیا ہے۔ حالانکہ محبت ایسی اذیت ناک نہیں ہوتی' ارے بے وقوف لڑکی! تم اس شخص سے توقعات وابستہ کیے بیٹھی ہو جس کے لیے اپنے احساسات جامد ہیں۔ حالانکہ محبت کی خوشبو تو فوراً" چاروں سمت پھیل جاتی ہے۔ اس فریب آرزو سے نکلو میرا! اگر تمہاری شادی اس شخص سے ہو بھی جاتی تو تم کبھی خوش نہ رہتیں۔ وہ ایک مختلف مٹی سے تخلیق ہوا ہے' تمہاری ٹائپ نہیں ہے وہ۔"

میں خاموشی سے روتی رہی۔ ایک عورت کا بس سوائے اپنے آنسوؤں کے کس پہ چلا ہے زین حیدر؟

☼ ☼ ☼

مجھے علم تھا کہ تم نے اس شادی کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا اور یہ ایک روایتی مرد کی سوچ تھی' ایک تعلیم یافتہ ڈاکٹر کی نہیں۔

مجھے بے حد دکھ ہوا' ایاز غلط نہیں کہتا تھا۔ تمہارا خمیر جانے کس مٹی سے اٹھا تھا' ورنہ صوفیہ بھی فطرتاً" بری لڑکی نہیں تھی۔ مسئلہ ہم آہنگی کا تھا اور قسمت نے اسے جانے کس عجیب چکر میں تم سے باندھ دیا تھا۔

مقدمہ تین سال تک چلتا رہا اور صوفیہ تم سے خلع حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

اس دوران تمہارا پروگرام بھی ختم ہوچکا تھا اور اب تم شاذ ہی دکھائی دیتے تھے۔

ایک دن کلب کے تمبولا میں تم سے ملاقات ہوگئی۔ تم بے حد افسردہ اور خاموش تھے۔

"میرا! دیکھ رہی ہو اس شخص کو' یہ صوفیہ سے نفرت کرتا تھا اور اس لیے ناخوش ہے کہ وہ آزاد اور مطمئن کیوں ہے۔" ایاز نے بڑی سخت آواز میں کہا۔

میں سوچتی رہی، آخر کب تک چلے گا یہ سب؟ کب تک میں ہر رشتے میں مین میخ نکال کر انکار کرتی رہوں گی۔ ایاز سمیت سب ہی میری اس روش سے ناخوش تھے کیونکہ دو چار رشتے ایسے بھی تھے جو ان کے نزدیک میرے لیے بے حد مناسب تھے۔

"تم بے حد غلط فیصلے کرتی رہی ہو میرا! تمہیں مکمل اختیارات ملنے ہی نہیں چاہیے تھے۔ آخر کیا کرو گی تم اپنی زندگی کے ساتھ؟" ایاز مجھے اکثر ڈانٹتا۔

اور ایک شام طارق روڈ پر پھر ایک اسنیک بار میں تم سے ملاقات ہوگئی اور بات اسی پرانے موضوع پر چلنے لگی۔ تم نے ورکنگ ویمن کو خوب برا بھلا کہا۔

"تم انڈر اسٹیمیٹ کر رہے ہو ورکنگ ویمن کو زین! اور صرف چند عورتوں کی وجہ سے، صرف اپنے ذاتی تلخ تجربے کی وجہ سے اور یہ انصاف نہیں ہے۔" زندگی میں پہلی بار مجھے تم پر بے حد غصہ آیا۔

"میں غلط نہیں کہتا میرا! پڑھی لکھی لڑکیوں کو نکیل ڈالنا واقعی مشکل ہو جاتا ہے۔ اپنی مثال لو کیوں شادی نہیں کی تم نے اب تک؟ مجھے معلوم ہے تمہارے لیے اچھے سے اچھا پروپوزل موجود تھا اور آج بھی ہیں لیکن بات یہی ہے ناکہ تم اس مکمل آزادی کو کسی دوسرے شخص کے لیے قربان نہیں کرنا چاہتیں۔" تم نے بڑی تلخی سے کہا۔

اور یہ تم نے کیا کہہ دیا تھا زین حیدر؟ مصلوب کر ڈالا تھا مجھے اپنی ہی وفا کی صلیب پر۔ ایک کیل اور گاڑ ڈالی تھی میرے دل میں اپنی بے مروتی سے۔ ساری کائنات چند ساعتوں کے لیے مٹ گئی تھی اور اس خلا میں پکار پکار کر میں خود سے پوچھ رہی تھی کیوں شادی نہیں کی میں نے اب تک؟ کیوں شادی نہیں کی میں نے اب تک؟

بمشکل تمام میں کہہ سکی۔

"زین حیدر! یہ آزادی بالکل بے معنی ہے میرے لیے، تم غلط سمجھے مجھے کیونکہ ایک غلامی ایسی بھی ہوتی ہے جو انسان بڑی خوشی سے، بڑی چاہ سے قبول کرتا ہے۔ بشرطیکہ تمہارے ساتھ تمہارا دل بھی اسیر ہو۔"

تمہیں وہیں حیران چھوڑ کر میں چل پڑی تھی۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا، درحقیقت تم بے حد کمزور اور بودے آدمی ہو۔ تم کسی عورت کو احساس تحفظ نہ دے سکو گے۔ تم اپنی بیوی کے دوست، غمگسار، ہمدرد بلکہ شریک کبھی نہ بن سکو گے۔"

اور آج شام جب میں موہن جودڑو پہ اس اسکرپٹ کو مکمل کر رہی تھی تم ایک بار پھر آنکلے۔

"میں اپنی ان پڑھ کزن سے شادی کر رہا ہوں، کم از کم اس کا دماغ اتنا خراب تو نہ ہوگا جتنا تعلیم یافتہ عورتوں کا ہوتا ہے۔"

تمہارے لہجے کی تلخی نے میرے آفس کا مہکتا ماحول بھی مسموم کر کے رکھ دیا۔

عجیب بات ہے میرے ہیرو! یہ سن کر مجھے ایسا قاتل دکھ نہیں ہوا۔ حالانکہ میں ایک بار پھر رو رہی ہوں، اس لیے نہیں کہ بہت سے چہروں سے نقاب کتنی دیر سے ہٹتے ہیں۔ ہم اپنی بیش قیمت چاہتیں کن پتھروں کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں، یہ لازوال جذبے جنہوں نے سلطنتوں کو ٹھوکر مار دی۔ کیسے کیسے بے قدرے لوگوں پر ضائع ہو جاتے ہیں اور یہ محض تمہاری خوش فہمی ہے کہ تمہاری ان پڑھ کزن بے زبان بھی ہوگی۔

پہلی بازی تو تم ہار گئے تھے زین حیدر! اور زندگی کا یہ اگلا محاذ آسان نہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے وہ اگلا آنے والا تم سے اپنی بساط سے بھی بڑھ کر مانگے اور جب تمہیں ہوش آئے گا بہت دیر ہو چکی ہوگی، کچھ بھی باقی نہ ہوگا۔

رات کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں کسی دیے کے سہارے (کہ تمہارے پاس نہ محبت کا نور ہے، نہ خلوص کی روشنی) اپنی گمشدہ جنت تلاشو گے یا انا کے انہی پُر غرور پہاڑوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر جاؤ گے۔

☆